ڈاکٹر نعیمہ بی بی
ٹیچنگ اینڈ ریسرچ ایسوسی ایٹ
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

اردو افسانہ نگاری کے تناظر میں ماہ نامہ ''عصمت'' کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ

ABSTRACT

Theematic study of the fications of the monthly Ismat in the context of Urdu fiction writing

By Dr. Naeema Bibi, Teaching and Research Associate, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad.

Most of the fiction published in the journal monthly *Ismat* is about the moral and educational condition of Muslims, especially Muslim women. Because the purpose of this journal was to promote such literature which could set the right direction for the society. Therefore, the monthly *Ismat* played its role well in this regard, And published such short stories Which presents to the reader every aspect of the human life Most of the women who write in the monthly *Ismat* are unknown, and even they are not professional writers. These women belongs from ordinary families. The common problems of life and their solutions can be seen in their fictions but these fictions cannot be judged on literary standards. The purpose of these myths is so strong that stories sometimes seem like long dialogues instead of stories. . This article is a thematic study of the fictions of the monthly Asmat in the context of Urdu fiction.

Keywords: Asmat, urdu short stories.,Prem chand, Rashid ul kheri.

ماہنامہ ''عصمت'' (جون ۱۹۰۸ء) کا اجرا ایسے وقت میں ہوا جب سرسید کی علی گڑھ تحریک کے نتائج پوری طرح سرایت کر چکے تھے۔ اور اس تحریک کے زیر اثر معاشرے کا جمود ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ لوگوں میں بیداری اور آگاہی کا نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ اردو ادب اس تحریک سے براہ راست متاثر ہوا اور اس تحریک کے زیر سایہ اصناف ادب نے تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں اس تحریک کے بعد اردو افسانے میں جدید رجحانات کا آغاز دیکھنے میں نظر آتا ہے۔ اردو افسانے کے اولین دور پر نگاہ ڈالیں تو ایک طرف سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری، مہدی افادی، نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار جیسے رومانیت پسندوں نے رومانوی اور تخیلاتی افسانے تخلیق کیے۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانوی فن پر نگاہ ڈالیں تو

فنی پختگی اور اردو افسانے کے ارتقا کے ابتدائی خدوخال واضح نظر آتے ہیں۔سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں رومانیت ہوس اور گناہ کی لذت آشنائی تک نہیں پہنچتی اور ایک پاکیزہ رومانویت کا عکس ان کے افسانوں میں جھلکتا ہے۔سجاد حیدر یلدرم کے افسانے، خارستان وگلستان،صحبت ناجنس، نکاح ثانی،سودائے سنگین، ازدواج محبت اور حکایات لیلیٰ مجنوں ان کی رومانیت کے عمدہ ترجمان ہیں۔مجنوں گورکھپوری کے مجموعہ سمن پوش کے افسانے، تم میرے ہو، شکست صدا، خواب و خیال، بیگانہ، اعلیٰ رومانوی افسانوی نثر کو ظاہر کرتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کے افسانے شہاب کی سرگزشت، شاعر کا انجام اور کیوپڈ سائیکی، ان کے نمائندہ افسانے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ان افسانوں کا اسلوب، فضا اور ماحول تخیلاتی و رومانوی ہے۔ رومانیت کے برعکس دوسری جانب پریم چند اور ان کے مکتبۂ فکر نے معاشرتی موضوعات کو اپنا کر اردو افسانے کو وسعت عطا کر دی۔ان لوگوں میں علامہ راشد الخیری، سلطان حیدر جوش اور حامد اللہ افسر وغیرہ اہم تھے۔ان لوگوں نے معاشرتی اور سماجی موضوعات پر قلم اٹھا کر اردو افسانے کا دامن وسیع کیا۔کرشن چندر کے افسانوں میں معاشرتی حالات کے زیر اثر محرومیاں واضح نظر آتی ہیں۔ان کے افسانوں میں پیا سا، برہم پتر، بالکنی، کالو بھنگی، ان داتا، ٹوٹے ہوئے تارے، سا جھے کا مردہ، کچرا بابا، خمیازہ، پالنا، یرقان، غالیچہ، ایک ایکسٹرا لڑکی اہم ہیں۔اگرچہ ان کے افسانوں میں معاشرتی و اخلاقی اصلاح اور روایات کی پاسداری کا نکتہ نظر واضح نظر آتا ہے۔لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے اپنے افسانے عام موضوعات اور معاشرے کے غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے کرداروں کے ذریعے پیش کر کے معاشرتی مسائل پر قلم اٹھانے کی جرأت کی اور اردو افسانے کو فروغ اور وسعت عطا کی۔ بعد میں اردو افسانے کو عروج عطا کرنے والوں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، غلام احمد عباس، عصمت چغتائی، منٹو، اوپندر ناتھ اشک، اختر انصاری اور احمد ندیم قاسمی کے نام شامل ہیں۔سعادت حسن منٹو نے اردو افسانے میں نہ صرف وسعت پیدا کی بلکہ اردو افسانے کو نئے موضوعات، نئے فنی زاویوں، نئی تکنیک اور نئے نکتہ نظر سے آشنا کیا۔منٹو کے افسانوں کا غالب موضوع عورت ہے۔''عورت'' میں بھی عام گھریلو عورت سے لے کر طوائف تک، اور طوائف بھی کم تر درجے کی۔منٹو کا خاص موضوع ہیں۔ ان کے نمائندہ افسانوں میں ہتک، کالی شلوار، خوشیا، بیچان، دس روپے، بلاؤز، دھواں، سرکنڈوں کے پیچھے، اللہ دتا، شاداں، ڈرپوک، بو، ٹھنڈا گوشت، ننگی آوازیں، نیا قانون، موذیل وغیرہ شامل ہیں۔منٹو اپنے افسانوں میں تمام اخلاقی پابندیوں کو توڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔اردو افسانے میں راجندر سنگھ بیدی ایک بہت بڑا نام ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ دانہ و دام تھا۔ دوسرے مجموعوں میں گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتی بودھ، شامل ہیں۔ان کے افسانے موضوعات کی وسعت کے ساتھ اعلیٰ فن کے عمدہ نمونے ہیں۔ان کے ہاں فکر کی بلندی اور سوچ کی گہرائی کی مثالیں بھی ملتی ہیں غلام عباس کے افسانے فن، تکنیک اور اسلوب تینوں لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ان کے افسانے اردگرد کی زندگی کے عمدہ عکاس ہیں۔ان کے اہم افسانوں میں اوورکوٹ، اس کی بیوی، بندروالا، آنندی، تنکے کا سہارا، دو تماشے، ناک کاٹنے والے، فینسی ہیئر کٹنگ سیلون، کتبہ، جواری، بحران، وغیرہ شامل ہیں۔خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی کے فن نے اردو

افسانے کو ایک عروج پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔عصمت چغتائی کا موضوع عورت اور جنس ہے۔عصمت نے اس حوالے سے کئی کامیاب افسانے لکھے ہیں عصمت چغتائی کے اہم افسانوں میں لحاف، بیگم جان۔ پردے کے پیچھے، گیندا، جال، بھول بھلیاں، شادی، تاریکی، بیڑیاں، بہو بیٹیاں' جنازے، چھوٹی آپا، وغیرہ شامل ہیں۔عصمت چغتائی کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ وہ معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرنے میں ماہر ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں قراۃالعین حیدر، انتظار حسین، انور سجاد، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور دوسرے بہت سے افسانہ نگار شامل ہیں۔ان کے افسانوں پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو قراۃالعین حیدر کے افسانوی مجموعے ستاروں سے آگے کو جدید اردو افسانے کا نکتۂ آغاز کہہ سکتے ہیں۔ پھر دوسرا افسانوی مجموعہ شیشے کے گھر ہے۔قراۃالعین حیدر کے اہم افسانوں میں یہ داغ داغ اجالا، کیکٹس لینڈ، برف باری سے پہلے، سرراہے، جب طوفان گزر چکا، آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا کیا شامل ہیں۔انور سجاد کے اہم افسانوں میں سازشی، آج، چھٹی کا دن، واپسی، دیوجانس، روانگی، وغیرہ شامل ہیں۔

ان افسانہ نگاروں کے افسانوں کے تناظر میں ماہنامہ ''عصمت'' کے افسانوں کو دیکھا جائے تو یہ افسانے ادب کے مرکزی دھارے میں کسی نمایاں مقام کے حامل نظر نہیں آتے۔اردو افسانہ قیام پاکستان کے بعد اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔مگر اس عروج میں ماہنامہ عصمت کے افسانے کسی نمایاں اہمیت کے حامل نہیں نظر آتے۔جبکہ اردو افسانہ ترقی کی نہج پر پہنچ چکا ہے۔ ماہنامہ ''عصمت'' کے افسانوں پر جو مقصدیت غالب ہے۔ یہ مقصدیت ان افسانوں کی فنی بالیدگی پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ اور ان افسانوں کو فنی پختگی کے لحاظ سے کمزور کرتی ہے۔ یہ گہری مقصدیت ان افسانوں کو ادب میں کسی نمایاں مقام تک پہنچانے میں رکاوٹ بنتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ افسانے اپنے دور کا کوئی بھی نام ور افسانہ نگار نہیں پیدا کر سکے۔خالص ادب کی کسوٹی پر مقصدی افسانہ کم درجہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانہ نگار ادبیت کی طرف توجہ کرنے کی بجائے مقصدیت پر دھیان دیتا ہے۔غالباً یہی وجہ ہے کہ ماہنامہ عصمت کے مشمولات کو ادبی معیارات کی کسوٹی پر پرکھ کر انھیں اعلیٰ ادب میں شمار کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ تاہم اس ماہنامے کی سماجی و معاشرتی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے کہ اس نے معاشرتی سدھار کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ ماہنامہ ''عصمت'' میں شائع ہونے والے زیادہ تر افسانوں کا موضوع مسلمانوں، خاص طور پر مسلمان عورتوں کی اخلاقی اور تعلیمی دگرگوں حالت ہے چوں کہ اس ماہنامے کا مقصد تھا کہ ایسا ادب پروان چڑھایا جائے۔ جو معاشرے کے لیے صحیح سمت متعین کر سکے۔ چناں چہ اس سلسلے میں ماہنامہ ''عصمت'' نے اپنا کردار بخوبی نبھایا۔ اور ایسے افسانے شائع کیے۔ جو زندگی کی ہولناکی کا ہر رُخ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ماہنامہ ''عصمت'' میں کئی معروف اور غیر معروف افسانہ نگار متنوع موضوعات پر افسانے لکھ رہے تھے۔ ان میں مرد اور خواتین دونوں کے موضوعات تقریباً یکساں ہی تھے۔ ان میں منشی پریم چند، قیصر جہاں بیگم، امتہ الوحی، زیب سعید، کنیز فاطمہ، سید رضا احمد جعفری، کوثر چاند پوری، ماہِ منیر، علی احمد شاہدی، سید انصار الہدیٰ، مریم مدنی، بدرالنساء رحمٰن، کیفی عظمت،

وحیدہ نسیم، عفت فریدی، محمد رمضان، نور جہاں تنویر، اختر بیگانہ، آثم مرزا، صغرا سبزواری، مہر النساء مہر، شہناز، سید ابو عاصم، رضیہ فصیح احمد، بلقیس بیگم، عائشہ صدیقہ، ادریس جمال، شانتی دیوی، عبدالمعید خان، اختر جہاں، امام اکبر آبادی، طارق احمد، وحیدہ نسیم، شمیم احمد پرویز، محمودہ حق، آمنہ نازلی، زینب گلشن، ملکہ افروز، ڈاکٹر صدیق احمد، عصمت رضوان اور بہت سے دوسرے افسانہ نگار شامل ہیں۔

ان کے افسانے اپنے موضوعات کے لحاظ سے تاریخ کی عمدہ عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔مسلمان معاشرے میں مسائل کے انبار، دین سے دوری، امیر کا مزید دولت کے حصول کے لیے پست سطح تک گرنا، اور امیر تر ہوتے جانا، غریب کا غربت کی سطح سے نیچے بد حال زندگی گزارنا، مزدور کے مسائل، ہر طرف عریانی و فحاشی، پھر خانگی زندگی کے مسائل، روپیا پیسا کی فروانی مگر سکون ندادر، شوہر بیوی کی موجودگی میں کسی سوسائٹی گرل سے شادی کر رہا ہے۔تعلیم یافتہ لڑکیاں اپنی سہیلیوں کے گھر اجاڑ کر خود ان کے شوہروں سے شادیاں کر رہی ہیں۔کچھ عورتیں مخلص ہو کر خدمتِ قوم کا فریضہ سر انجام دے رہی ہیں۔تو وہیں ایسی عورتیں بھی موجود ہیں۔ جو مذہب و حیا سے دور ہو کر اس مقدس کام کو خواتین کے لیے طعنہ بنا رہی ہیں۔مسلمانوں کا معاشرہ اس قدر تباہ حال ہو گیا ہے کہ چوری ڈکیتی ہی نہیں۔قتل و اغوا کے واقعات جو پہلے کبھی کبھار سننے میں آتے تھے اب روزمرہ ہو رہے ہیں۔رشوت کا بازار گرم ہے۔ جو شخص با اقتدار ہے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے لوٹ رہا ہے۔ ہر چیز مہنگی سے مہنگی تر ہوتی جا رہی ہے۔جس کے پاس دولت ہے۔ اصل حکمرانی اسی کی ہے۔عزت کا تصور بدل گیا ہے۔ پہلے خاندانی شرافت دیکھ کر عزت کی جاتی تھی۔اب پیسے کو دیکھ کر عزت کی جاتی ہے۔ ماہنامہ ''عصمت'' میں ان سب موضوعات پر مختلف افسانے تحریر کیے گئے۔

ماہنامہ ''عصمت'' میں شائع ہونے والے افسانوں کا زیادہ تر موضوع ''عورت'' ہے۔عورت جو معاشرے میں مختلف کرداروں کے روپ میں نمایاں ہے۔اور ہر روپ ہی اسے منفرد اور یکتا بناتا ہے۔شادی شدہ عورت کہیں بیوی ہے، تو کہیں کسی دوسری عورت پر سوتن بن کے جاتی ہے۔تو کہیں جہیز کم لانے پر اس کو طعنے سننے پڑتے ہیں۔جبکہ مرد اپنی بالا دستی ختم کرنے کو تیار نہیں ہے۔قیصر جہاں بیگم کا افسانہ ''آنسو'' ایک مظلوم عورت اور مرد کی بالا دستی کا عمدہ عکاس ہے۔ یہاں مرد ہر جرم کا قصور وار عورت ہی کو ٹھہراتا ہے۔خود کسی جرم کا اقرار نہیں کرتا۔عورت کی خواہشات کو بری طرح کچلا جاتا ہے۔عورت کو گھر کے اندر نوکرانی سے زیادہ وقعت حاصل نہیں ہے۔ اس کو گھر کے کسی معاملے میں بولنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔رادھا اس افسانے میں مرکزی کردار کی صورت نمایاں ہوتی ہے۔ جو تمام عمر شوہر اور سسرال والوں کی خدمت کرتی رہتی ہے۔مگر اس کے باوجود اس کا شوہر اس کو گھر سے نکال باہر کرتا ہے۔ اور آرام سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ رادھا آخری وقت تک یہی سوچتی رہتی ہے۔کہ معاشرے میں اس کی حیثیت اور وقعت کیا ہے؟(۱)

افسانہ ''مدھ بھرے نین'' بھی مرد کی بالا دستی اور عورت کی مظلومیت کی ترجمانی کرتا ہے۔جس میں شوہر اپنی شکی

طبیعت کی بنا پر اپنی بیوی کو ذہنی و جسمانی تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ انعم کو معلوم ہے کہ اس کا شوہر نفسیاتی طور پر بیمار ہے۔ لیکن اگر وہ شوہر کے نفسیاتی علاج کے لیے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرتی۔ تو اس کا شوہر اس کو ہمیشہ کہتا کہ تم اس ڈاکٹر کو کیسے جانتی تھیں۔ اگر وہ کہتی کہ میں اس کو نہیں جانتی تو وہ ہمیشہ یہ اعتراض کرتا کہ پھر وہ ڈاکٹر انعم سے ہنس ہنس کر باتیں کیوں کر رہا تھا۔ افسانے میں عروج اس وقت آتا ہے۔ جب انعم کا شوہر اس پر شدید شک کرتا ہے اور اس کو گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ انعم جب ماں باپ کے گھر آتی ہے تو سب اسے ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ شوہر صرف ذرا سے شک کی بناء پر بیوی کے کردار کی دھجیاں بکھیر دے۔ تب بھی اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ معاشرے کی اس خرابی کو واضح طور پر اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ انعم شوہر کے ہاتھوں اتنی اذیت اٹھاتی ہے۔ کہ خود کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگتی ہے۔ اور پھر جب اس کا شوہر اس کو کہتا ہے کہ وہ گلی میں کھڑے ہو کر کس کو دیکھتی ہے۔ تو انعم شدید غصے میں اپنی آنکھیں پھوڑنے کا ارادہ کر لیتی ہے۔ مگر چشم تصور سے وہ دیکھتی ہے کہ اس کے شکی مزاج شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اور اس کی سوتن اس کے بچوں کے ساتھ بہت برا سلوک کر رہی ہے۔ انعم یہ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوتی ہے۔ مگر پھر وہ اپنی آنکھیں پھوڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں اپنے مدھ بھرے نین نہیں پھوڑوں گی۔ جن کی وجہ سے میرا شوہر مجھ پر شک کرتا ہے۔ بلکہ میں حالات کی تلخی کا مقابلہ کروں گی۔ اور شوہر کے ظلم کا سامنا کر کے حالات کو بدلنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ (۲)

یہ افسانہ اور اس جیسے کئی دوسرے افسانے عورت کو ظلم و ستم کے خلاف مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتے ہیں۔ تو دوسری جانب ایسے بھی افسانے لکھے گئے جن میں عورتوں کو ان کی غلط روش کی بنا پر ٹوکا گیا۔ ایسی عورتوں کی کہانیاں پیش کی گئیں جو وقتی طور پر جذبات کی رو میں بہہ کر عبرت کا نقشہ بن جاتی ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار رابعہ اپنے کالج کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ غلط دوستوں کی صحبت میں پڑ کر اپنا آپ گنوا دیتی ہے۔ غیر مردوں کے ساتھ مل کر پارٹیاں اور پکنک منانا اس کا دلچسپ مشغلہ بن جاتا ہے۔ وہ جن دوستوں کے ساتھ پکنک پر جاتی تھی۔ اس سارے گروپ کو ''قادر چاچا'' کی نگرانی حاصل تھی۔ ''قادر چاچا'' جو دلالی کا کام کرتا تھا۔ اس کا عین نشانہ ایسی بے وقوف لڑکیاں تھیں۔ جن کے حسن کی تعریف کر دی جائے تو وہ اپنا آپ بھی آسانی سے پیش کر دیتی ہیں۔ رابعہ جب تک کنواری تھی۔ ہر مرتبہ کالج میں کسی جلسے، تقریب، پارٹی یا فنکشن کا بہانہ کر کے چلی جاتی۔ اکثر تو وہ کالج جاتی ہی نہ تھی۔ مگر جب رابعہ کی شادی ہو گئی تو قادر چاچا پھر بھی اپنی پارٹیاں رنگین کرنے کے لیے رابعہ کو بلاتا تھا۔ مگر جب رابعہ نہیں گئی تو اس نے دھمکی دی۔ کہ وہ اس کی قابل اعتراض تصویریں اس کے شوہر تک پہنچا دے گا۔ مجبوراً رابعہ کو قادر چاچا کے پاس جانا پڑتا۔ جب رابعہ کے شوہر کو اس سارے قصے کا پتا چلا تو اس نے رابعہ کو طلاق دے دی۔ اور اس کی بیٹی کو بھی اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔ قادر چاچا نے رابعہ کی بیٹی کو ایک مسجد میں پھینک دیا۔ اور رابعہ کو دن میں فیکٹری کی ملازمت پر لگا کر رات کو اسے مختلف ہوٹلوں میں بھیجتا۔ جہاں رابعہ کی راتیں عیاش آدمیوں کی سنگت میں گزرتیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کے دن پورے کرنے میں مصروف رہی۔ (۳)

یہ افسانہ اور اس جیسے کئی دوسرے افسانے عورت کو ظلم وستم کے خلاف مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتے ہیں۔ اور جب ان کی آنکھیں کھلتی ہیں تو سب کچھ برباد ہو چکا ہوتا ہے۔ افسانے ''ثریا'' میں ثریا کا کردار ایسی عورتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جو اپنے گھروں کو نظر انداز کر کے باہر کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ ثریا دو معصوم بچوں اور اپنے فرشتہ صفت شوہر کو چھوڑ کر حامد سے شادی کرتی ہے۔ جو دراصل ثریا کی جائیداد کو حاصل کرنے کے چکر میں تھا۔ اور جب وہ ثریا سے شادی کے بعد وہ سب کچھ پا لیتا ہے۔ جس کی اسے تمنا تھی۔ تو وہ ثریا کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کر لیتا ہے۔ اس وقت ثریا خالی دامن رہ جاتی ہے۔ نہ شوہر کا پیار اور نہ ہی بچوں کا ساتھ نصیب ہوتا ہے۔ (۴)

افسانہ ''نگار'' بھی راہ سے بھٹکی ہوئی عورت کی کہانی ہے۔ افسانے کا عنوان ہی اپنے اندر یہ معنی پوشیدہ رکھتا ہے کہ یہ نگار نامی کسی عورت کی کہانی ہے۔ نگار ایک امیر باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ جس کی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ہر بات میں غرور در آتا ہے۔ اور وہ اخلاقی تباہی سے دوچار ہو جاتی ہے۔ زندگی میں بہت سے مسائل کا شکار ہونے کے بعد بھی وہ اپنی آزاد خیالی کی ڈگر سے نہیں ہٹتی۔ اور نہ ہی معاشرے کی بنائی ہوئی حدود وقیود کا کوئی خیال کرتی ہے۔ ماں باپ سے بغاوت کر کے من پسند شادی کر لیتی ہے۔ مگر حالات کی سنگینی کا اندازہ نگار کو اس وقت ہوتا ہے۔ جس اس کا شوہر اسے بتاتا ہے کہ اس نے نگار سے شادی صرف پیسے کے لیے کی ہے۔ اور جب نگار اس کو مطلوبہ دولت دینے میں ناکام ہوتی ہے۔ تو وہ نگار کو چھوڑ کر کسی نئی عورت کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ نگار شوہر سے ٹھکرائے جانے کے بعد باپ سے دوبارہ رجوع کرتی ہے۔ یہاں نگار ایک باغی، سرکش اور ضدی عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ جو انتہائی خودغرض ہے اور اسے اپنے سوا کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ نگار اپنے باپ کو دھمکی دیتی ہے کہ اگر انھوں نے نگار کو جائیداد میں حصہ نہ دیا۔ تو وہ عدالت میں جا کر ان کی عزت کی دھجیاں بکھیر دے گی۔ یہ بات اس کے والدین کو سخت صدمہ پہنچاتی ہے مگر وہ عزت کے ڈر سے نگار کا حصہ تمام کا تمام اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ نگار اس تمام دولت کو اپنی شاہ خرچیوں میں ضائع کر دیتی ہے۔ وہ ایک فلم ڈائیریکٹر کی باتوں میں آ کر اپنا تمام سرمایہ ایک فلم پر لگا دیتی ہے۔ جس کے بارے میں اسے سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ اس اس فلم کی ہیروئن آئے گی۔ مگر جب نگار کے پاس پیسا ختم ہو جاتا ہے۔ تو ڈائریکٹر اس کو مکھن سے بال کی طرح نکال کر الگ کر دیتا ہے۔ شہر بھر میں نگار کے حسن کے چرچے ہوتے تھے۔ اور اس کے پیسے کی وجہ سے سب آگے پیچھے پھرتے تھے۔ مگر جب پیسا نہ رہا۔ تو سب لوگوں نے منہ موڑ لیا۔ (۵)

یہ افسانہ اور اس جیسے کئی دوسرے افسانے عورت کو ظلم وستم کے خلاف مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتے ہیں۔ ورنہ لوگ جو پہلے پیسے کی بدولت انسان کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ جب دولت ختم ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے بھاگ نکلتے ہیں۔ تب ہی عورتوں کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ بہت سے افسانے ایسے لکھے گئے جن میں مذہبی حوالے سے عورتوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ اپنے آپ کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ تب ہی وہ معاشرے میں کامیاب ہو سکیں گی۔ افسانہ ''ٹی پارٹی''

مذہبی حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں زرینہ ایک مرکزی کردار کی صورت میں نمایاں اور باقی تین دوستیں تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اظہار خیال کرنے کے لیے نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ زرینہ بی اے پاس کرنے کی خوشی میں اپنی چار سہیلیوں کو اپنے گھر مدعو کرتی ہے۔ چائے کے دوران چاروں نے عصر حاضر کے ہر مسئلے کو زیرِ غور لایا۔(۶) چوں کہ یہ افسانہ تقسیم پاکستان کے فوراً بعد لکھا گیا۔ اس لیے اس افسانے میں زیر بحث تمام موضوعات کا تعلق اس وقت کے مسائل سے ہے۔ جن سے پاکستانی معاشرہ دوچار تھا۔ دراصل افسانہ نگار ان سہیلیوں کی بحث کے ذریعے اسلام، اسلامی عقائد، عورت اور معاشرے کے مسائل کو واضح کرنے کی کوشش میں ہے۔ پاکستان نیا نیا آزاد ہوا ہے۔ ایسی مملکت کو سنبھالنے کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا بھی آگے بڑھنا ازحد ضروری ہے۔ افسانے کے چاروں کردار اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اب عورتیں آزاد ہیں۔ وہ مردوں کی غلام نہیں ہیں۔ مسلمان اسی وقت ترقی کریں گے۔ جب عورتیں ان کے دوش بدوش چلیں گی۔ دراصل افسانہ نگار عورتوں کی تعلیم و ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی بحث میں یہی دکھا رہی ہیں کہ بڑے بڑے قومی رہنماؤں کی بیگمات نہ صرف خود زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ بلکہ دوسری عورتوں کو بھی جہد مسلسل اور گھروں سے نکل کر قومی خدمت سرانجام دینے کی ترغیب دے رہی ہیں وہ کہتی ہیں کہ جب عورتیں خود کو سدھار لیں گی تو معاشرہ اور ملک دونوں ترقی کریں گے۔

ماہنامہ ''عصمت'' میں بہت سے افسانے ایسے لکھے گئے جن میں خواتین کو مردوں کے دوش بدوش تمام اخراجات میں حصہ ڈال سکیں۔ اس طرح گھریلو جھگڑے کم سے کم ہوں گے اور ان سے نجات پائی جا سکے گی۔ افسانہ ''بکواس تو نہ تھی'' دو میاں بیوی کے گھریلو اخراجات کے تنازع اور پڑوسن کی نصیحت پر مشتمل ہے۔(۷) افسانہ نگار اس افسانے کے ذریعے گھر بیٹھی خواتین کو گھریلو دستکاریوں کی جانب متوجہ کر رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ گھر بیٹھ کر کوئی با ہنر اور فائدہ مند کام کر کے نہ صرف گھریلو آمدنی میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ بلکہ گھروں میں رہ کر اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت بھی پرسکون طریقے سے کر سکتی ہیں۔ پڑوسن یہی نصیحت دونوں میاں بیوی کو کرتی ہے۔ جو آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ وہ ان کو مشورہ دیتی ہے کہ اگر بیوی شوہر سے لڑنے جھگڑنے کے بجائے گھریلو اخراجات کم کرنے کے لیے گھر میں کوئی معمولی سا کام بھی شروع کر دیں۔ تو وہ اچھا خاصا کما سکتی ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی اس تجویز پر متفق ہو جاتے ہیں۔ آخر میں افسانہ نگار یہی کہتی ہیں کہ یہ سب نصیحت جو انھوں نے دو میاں بیوی کو کی، وہ کوئی بکواس نہیں تھی۔ بلکہ گھر بیٹھی مستورات اس سے قدرے استفادہ کر سکتی ہیں۔ اور گھریلو جھگڑوں سے آزاد ہوا جا سکتا ہے۔

افسانہ ''وہ احمق نہ تھی'' بھی مقصدی اور اصلاحی ہے۔ اس افسانے کا موضوع عورت کو دلیری اور بہادری کی طرف راغب کرنا ہے۔ اور مرد کی ناجائز مداخلت سے خود کو بچانے کی ترغیب دینا ہے۔ افسانے میں سلیم کا کردار انتہائی جابر اور ظالم مرد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جو نہ صرف نکما تھا۔ بلکہ ہر وقت نشے میں دھت رہنے کی وجہ سے اپنی بیوی عائشہ پر تشدد اور

مار پیٹ بھی کرتا تھا۔ اور اس کی بیوی سلائی کر کے جو پیسے کماتی تھی وہ بھی اس سے چھین لیتا تھا۔ سلیم نے اپنی بیوی پر مظالم کی انتہا کر دی تو عائشہ نے اس سے طلاق لے لی۔ مگر طلاق یافتہ ہونے کا طعنہ اس کے لیے وبال جان بن گیا۔ محلے والے اسے بد کردار سمجھتے۔ اور باپ کے گھر میں اسے ذلیل وخوار کیا جاتا۔ کیوں کہ یہ دو بیٹوں کے ساتھ طلاق لے کر ان کے گھر آ بیٹھی تھی۔ عائشہ نے ان نامساعد حالات کا سامنا دلیری سے کرنے فیصلہ کیا۔ اس نے دل میں آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ اور مزدوری کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرنے لگی۔ اس طرح اس نے صرف اپنے بیٹوں کی اچھی تربیت کی۔ بلکہ وہ دونوں زندگی میں بہت کامیاب وکیل اور انجینئر بنے۔ دونوں بیٹوں نے ماں کا بھرپور خیال رکھا۔ اور اپنی ماں کو حج پر بھیج دیا۔ (۸) ایسے افسانے دراصل عورتوں کو زندگی میں آگے بڑھنے کی ترغیب وتحریک دے رہے تھے۔ ماہنامہ ''عصمت'' کے اجرا کا مقصد ہی عورتوں میں بیداری پیدا کرنا تھا۔ یہ افسانے عورت کو نہ صرف اس کی کمزوریوں سے آگاہ کر رہے تھے بلکہ اسے آگے بڑھنے میں مدد بھی فراہم کر رہے تھے۔ افسانہ ''ریشماں'' ایسی عورت کی کہانی ہے۔ جو فیشن پرست ماڈرن عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ریشماں جو خود کو ہمیشہ دوسروں سے منفرد سمجھتی آئی ہے۔ وہ نئے زمانے کی ڈگر پر چلنا چاہتی ہے۔ خوش قسمتی سے ریشماں کا شوہر کمال انگلستان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ وہ ایسا شوہر پا کر بہت خوش ہوتی ہے۔ مگر سسرال آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا شوہر مشرقی اقدار وروایات کا دلدادہ ہے۔ ریشماں کو اپنے شوہر کی عادتیں سخت ناپسند ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو نائٹ سرکل میں لے جا کر خود کو ماڈرن ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ آخر کار اس کی روز روز کی فرمائشوں سے تنگ آ کر کمال اس کے ساتھ نائٹ کلب جانے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ ریشماں بے حد مسرور تھی کہ اس کا شوہر جدید تراش خراش کے پینٹ کوٹ میں ملبوس بالکل انگریز لگتا ہے۔ اور وہ کلب میں سب سے بہترین ناچ رہا ہے۔ کلب کی ہر لڑکی کی نظر کمال پر تھی۔ ریشماں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کمال اس قدر آسانی سے نئی روش اختیار کر لے گا۔ کلب میں بہت سی عورتوں میں کیلی بھی شامل تھی۔ جو آکسفورڈ میں کمال کی کلاس فیلو تھی۔ اس نے کمال کو دعوت دی۔ کہ وہ اس کے ساتھ رقص کرے۔ کلب میں اس بات کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا کمال کیلی کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ یہ سب دیکھ کر ریشماں کے دل کو دھچکا لگتا ہے کہ اپنے شوہر کو یہاں تک لانے کی ذمے دار وہ خود ہے۔ اس کے اندر سوئی ہوئی عورت جاگ اٹھتی ہے۔ ریشماں کا دل چاہتا ہے کہ وہ کیلی کے بال نوچ لے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ خود ساختہ اصولوں نے اس کی زبان پر تالے ڈال دیے ہیں۔ اس کو شدید غصہ آتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرے دن کمال یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ ریشماں نے جدید مغربی لباس کے بجائے سادہ ساڑھی زیب تن کر رکھی ہے۔ اور وہ کھل کر اس نئی روش پر تنقید کر رہی ہے۔ (۹) پاکستانی معاشرے میں مغربی انداز اور طور طریقے اپنانے والوں کو بہت اعلیٰ، معزز اور فیشن یافتہ تصور کیا جاتا ہے۔ مگر ایسے افسانے لکھ کر اس تصور کی بھرپور نفی کی گئی۔ کہ یہ بالکل غلط تصور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی معاشرہ لادین ہے۔ اور ریشماں جیسی عورت کا کردار عورتوں کی اصلاح کے لیے ایک تازیانے کا کام کرتا ہے۔

ماہنامہ ''عصمت'' میں بہت سے افسانے خواتین کی اصلاح کے حوالے سے تحریر کیے گئے۔ان میں متنوع اقسام کی تجاویز پیش کی گئیں۔جن کے ذریعے خواتین کو ایک راستہ متعین کر کے دیا گیا جس پر چل کر وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتی ہیں۔ اور ایک کامیاب زندگی بھی گزار سکتی ہیں۔اس طرح بہت سے افسانے محنت کش عورتوں کی زندگی پر محیط تحریر کیے گئے۔ان کو تحریر کرنے کا مقصد خواتین کو عملی زندگی میں قدم آگے بڑھانے میں مدد دینا تھا۔اور انھیں زندگی کی المناکی کی تصویر دکھانا ہے۔یہ افسانے اپنے اندر کئی معنی پوشیدہ رکھتے ہیں۔اور ان کو پڑھ کر خواتین کی ہمت وعظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔افسانہ ''بوبو جان'' ایک باہمت باشعور عورت کے کردار کو ظاہر کرتا ہے۔جو اپنے بچوں کو ان کی زندگی گزارنے کا ہر حق دیتی ہے۔بوبو جان نہ صرف سلجھی ہوئی عورت ہے بلکہ وہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنے بیٹوں کی بہترین پرورش کرتی ہے۔اور جب وہ دونوں شہر منتقل ہونے کا ارادہ کرتے ہیں۔تو بوبو جان انھیں خوشی خوشی شہر روانی کرتی ہے۔اور کچھ عرصے بعد وہ جب اپنے بیٹے اور بہو کو ملنے کے لیے شہر آتی ہے۔تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کہ ان کی بہو بھی نوکری کرنے لگی ہے۔مگر جب انھیں پتا چلتا ہے کہ بہو اپنی تعلیم کو کام میں لانا چاہتی ہے۔تو انھیں خوشی ہوتی ہے۔ان ہی دنوں بوبو جان کو چھوٹے بیٹے کا خط ملتا ہے۔جس میں اس نے اپنا نکتہ نظر واضح کیا ہوتا ہے۔کہ اس نے اپنی پسند سے شادی کر لی ہے۔بہت اچھا خاندان ہے۔بوبو جان چوں کہ سلجھی ہوئی ماں ہے۔وہ بیٹے کی اس خواہش کا احترام کرتی ہیں اور اپنی نئی بہو کو دیکھنے کے لیے خوشی خوشی روانہ ہوتی ہیں۔(۱۰) بوبو جان جیسے کردار مثالی عورتوں کے کردار ہیں۔جو عورت کی اعلیٰ ظرفی ظاہر کرتے ہیں۔دوسری طرف افسانہ ''نوابن'' میں نوابن کا کردار عورت کی مظلومیت، ان تھک محنت اور بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔بچپن سے لے کر بڑھاپے تک مسلسل محنت کرتی نوابن ایک عورت کی زندگی کا استعارہ ہے۔نوابن وہ عورت ہے۔جو ماں باپ کے گھر کا بوجھ ہے۔سسرال میں نوکرانی اور بڑھاپے میں بہوؤں کے لیے ناکارہ اور فضول ترین شے۔نوابن کا ایک کردار عورت کی زندگی کے ہر مرحلے کو واضح کرتا ہے۔افسانے میں نوابن باپ کے گھر سے سسرال میں قدم رکھتے ہی نشئی شوہر کے ہاتھ چڑھ جاتی ہے۔اور پھر زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے خود محنت مشقت کرنا شروع کر دیتی ہے۔اور جب وہ بڑھاپے کو پہنچتی ہے۔تو اس کے بیٹے اور بہو اس کو گھر کا بوجھ قرار دے دیتے ہیں۔کہ اب وہ کوئی کام کر کے پیسے کمانے کے قابل نہیں ہے ہم پر ایک بوجھ بن گئی ہے۔ مفت کی دو روٹیاں روز کھا لیتی ہے۔نوابن معاشرے کی بے حسی کی علامات ہے۔جہاں عورت بے بس اور لاچار ہے۔اور معاشرہ طاقتور ہے۔(۱۱)

افسانہ ''ایک سوال'' معاشرے کے باپ بھائیوں سے ایک سوال ہے۔کہ ان کی غیرت اور حمیت کہاں جا کے سو گئی ہے۔کہ اب وہ اپنی بیٹیوں کی کمائی پر مکان اور بینک بیلنس بناتے پھرتے ہیں۔اور انھیں اس بات کی پرواہ بھی نہیں کہ ان گھر انے کی لڑکی کن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے کے بعد اپنی عزت نفس مار کر کماتی ہے۔وہ تو بس ان کی کمائی پر خوش ہوتے ہیں۔اور پیسے دیکھ کر سب عزت بھول جاتے ہیں۔اس افسانے میں نسیم کا کردار ایک ایسی لڑکی کے طور پر سامنے لایا گیا

ہے۔ جو پیسے کی خاطر ایک بدنام کمپنی میں ملازمت کرتے خود بھی بدنام ہو چکی ہے۔مگر اس کے باپ اور بھائی اس کے کمائی پر عیش کر رہے ہیں۔اور اس کے انجام سے بے خبر آنکھیں بند کر کے صرف پیسے کے لیے خاموش ہیں۔ان کی بیٹی کی زندگی برباد ہو رہی ہے۔مگر انھیں پرواہ نہیں ہے۔اور وہ اپنے مادی فوائد میں الجھے ہیں۔(۱۲)

عورت معاشرے کی وہ اکائی ہے۔جس کے ساتھ خاندان کا ہر فرد جڑا ہوا ہے۔عورت کا سب سے مضبوط اور طاقتور روپ ماں کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ماہنامہ ''عصمت'' کا مقصد عورتوں کی اصلاح اور بیداری ہے۔ اس لیے اس ماہنامے میں بہت سے افسانے بچوں کی پرورش سے متعلق تحریر کیے گئے۔جن میں ماؤں کو بتایا گیا کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کس طرح دینی، نفسیاتی اور جذباتی طور پر بہتر کر سکتی ہیں۔تاکہ مستقبل میں قوم کے اچھے معمار ثابت ہوں۔افسانہ ''بچے کی نفسیات'' میں دو بہنیں اپنے بچوں کے رویے سے سخت پریشان اور نالاں ہیں۔افسانہ نگار نے چھوٹے چھوٹے نکات سے خواتین پر واضح کر دیا کہ وہ بچوں کو مکمل توجہ دیں۔اور ان کو نظر انداز کرنے سے گریز کریں۔ ورنہ وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جائیں گے۔افسانے میں زہرہ اپنے بچوں کے حوالے سے کافی فکر مند نظر آتی ہے۔لیکن وہ اپنی بہن سے اپنے بچے کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ اس کا بیٹا پڑھائی اور سکول میں بہت اچھا تھا۔ ہر کوئی اسے پسند کرتا تھا مگر چوں کہ اسے چھوٹا بچہ زیادہ ذہین اور تیز تھا۔اس لیے سکول اور گھر میں ہر جگہ چھوٹے بچے کی تعریفیں ہونے لگیں۔ یہ سب دیکھ کر بڑا بھائی الگ تھلگ اور چپ چاپ رہنے لگا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر غصے میں آنے لگتا ہے۔ اور اپنے سب چھوٹے بہن بھائیوں کو مارتا رہتا ہے۔ زہرہ کی بہن نے سب مسائل غور سے سننے کے بعد کہا کہ ان حالات و واقعات کے پیچھے اکثر سب قصور ماں باپ کا ہوتا ہے۔ جو ایک اولاد کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں۔مثلاً بیٹے کو ہمیشہ بیٹی پر ترجیح دی جاتی ہے۔اس طرح ایک بچے کی پیدائش سے پہلے بچے پر کم توجہ شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح بچے کی نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔تمام بچے پیدائشی طور پر معصوم اور بے ضرر ہوتے ہیں۔ ان میں نیکی، ذہانت، شرافت، صبر و تحمل، غصہ، تندی و تیزی، سستی و کاہلی، کچھ موروثی اور کچھ جبلی ہوتی ہیں۔لیکن بچے کے کردار میں بلند حوصلگی، سادگی، خود اعتمادی، ایثار و قربانی، خوش اخلاقی، رشک، حسد، بغاوت۔غصہ، جلد بازی، ایسی صفات ہیں۔ جو گھریلو ماحول والدین کے اخلاقی، اذدواجی اور معاشرتی تعلقات اور بچہ کی اپنی ذات پر توجہ یا عدم توجہ کی بنا پر پروان چڑھتی ہیں۔اس لیے بچے کی پرورش میں اس کو ذہنی سطح کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے اور اس کی اہمیت کا وقتاً فوقتاً اسے احساس دلانا چاہیے۔(۱۳)

یہ افسانہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے اور موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔مگر اس افسانے پر مقصدیت اتنی غالب ہے۔ کہ مکالمے لیکچر معلوم ہوتے ہیں۔جس کو پڑھ کر قاری اکتانے لگتا ہے۔ یہاں نذیر احمد کے طویل مکالموں کا انداز غالب ہے۔ افسانہ ''میں اکیلی رہ گئی'' بھی موضوع کے لحاظ سے بچوں کی تعلیم و پرورش کے حوالے سے ہے۔ افسانے میں ناہید کا کردار ضدی اور غودسر عورت کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ دراصل ناہید کی بچپن سے پرورش غلط انداز میں کی گئی جس کا نتیجہ

یہ نکلا کہ وہ میکے سسرال ہر جگہ بے جا ضدا ور غصہ دکھاتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ لوگ خاموشی سے اس کی باتیں مانتے چلیں جائیں۔ اور کوئی اس کے سامنے اُف بھی نہ کرے۔ وہ شوہر سے ہر وقت لڑائی کرتی رہتی ہے۔ جب اس کا شوہر اسے سمجھا سمجھا کر تنگ آیا تو ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ ناہید خاموش رہنے لگی۔ اور جب وہ اپنا محاسبہ کرتی ہے۔ تو اس کو احساس ہوتا ہے۔ کہ والدین کی وفات کے بعد اس کی دادی نے اس کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے کی تھی۔ اگر ناہید کوئی غلط کام کرتی۔ اگر کوئی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ تو دادی غصے میں الٹی سیدھی سنانا شروع ہو جاتیں۔ کہ بن ماں باپ کی بچی کے ساتھ یہ اچھا سلوک نہیں ہے۔ ان باتوں نے ناہید کا حوصلہ کئی گنا بلند کر دیا تھا۔ وہ خودسر سے خودسر ہوتی چلی گئی۔ اور شوہر سے محروم ہو کر اکیلی رہ گئی۔ (۱۴)

جو والدین دینی اور اخلاقی لحاظ سے بچوں کی اچھی پرورش نہیں کرتے۔ ان کے بچے بڑے ہو کر والدین کے ساتھ غیر اخلاقی رویہ اپنانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ افسانہ ''گھر سے دور'' میں ہندوستانی معاشرے میں بچوں کو مغربی اقدار سے واقفیت سے متعلق تحریر کیا گیا۔ یہ افسانہ ایسے والدین کے لیے ایک تازیانہ ہے جو اپنے بچوں کو جدید بنانے کے لیے انگریزی سکولوں میں بھیجتے رہتے ہیں۔ اور انھیں اخلاقی طور پر تباہ کر دیتے ہیں۔ افسانے میں شہناز کا کردار ایک ضدی اور خودسر لڑکی کے روپ میں ابھر کر آتا ہے۔ جس کی بچپن اور جوانی کی تمام تعلیم کانونٹ اور انگریزی سکولوں سے ہوئی ہے۔ ایک ہوائی جہاز کی کمپنی یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ ہر صوبے سے منتخب کر کے ایک لڑکی کو لندن کی مفت سیر کرائے گی۔ خوش قسمتی سے شہناز اپنے صوبے سے منتخب کر لی گئی۔ مگر جب وہ ہندوستان سے لندن گئی۔ تو پھر لوٹ کر نہیں آئی۔ اس نے اپنے والدین کو تار بھیجا اس میں لکھا لندن اس کو بہت پسند آیا ہے۔ وہ اس کو بالکل اپنے گھر کی طرح لگتا ہے۔ وہ یہاں لندن میں ایک آدمی جان سن کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ اس کا بہترین دوست ہے۔ شہناز کے والدین نے اپنی دانست میں اسے لندن بھیج کر بہت اہم فیصلہ کیا تھا۔ وہ خود کو خوش نصیب سمجھ رہے تھے۔ مگر ان کا یہ فیصلہ اس وقت ان کو غلط لگا جب ہر کوئی ان سے شہناز کے متعلق سوال کرنے لگا کہ وہ لندن سے کب واپس آئے گی۔ آخر کار والدین نے اس سارے مسئلے کو چھپانے کے لیے ایک جواب گھڑ لیا اور سب کو کہنے لگے کہ وہ لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ شہناز اپنے والد اور چچا کی ایک ہی اولاد تھی اور تمام جائیداد کی اکلوتی وارث تھی۔ اس کے باپ کو یہ بھی فکر لاحق تھی۔ کہ اگر وہ نہ لوٹی تو جائیداد کا کیا بنے گا۔ شہناز کے دادا نے اس سارے مسئلے میں شہناز کو بے قصور ٹھہراتے ہوئے والدین سے کہا کہ جب شہناز نے بسم اللہ کہنے کے بجائے بابا بلیک شیپ زبانی یاد کی تھی۔ اور کلمہ طیبہ کے بجائے نرسری رائمس پڑھتی تھی۔ اس وقت اگر اسے دینی ماحول اور دینی تعلیمات سے بہرہ مند کیا جاتا۔ تو شہناز لندن میں رہنے کے بجائے ہندوستان آنے کو ترجیح دیتی۔ اس لیے شہناز کے دادا نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ اپنا پیسا اور وسائل بروئے کار لاتے ہوئے لڑکیوں کے مدارس کھلوائیں گے۔ جن میں پڑھنے والی تمام لڑکیاں نیک اور دین دار ہوں گی۔ اور وہ کبھی ہندوستانی معاشرے کو چھوڑ کر لندن میں بسنے کا خیال دل میں نہیں لائیں گی۔ (۱۵) اس طرح قاری کو ترغیب کی گئی کو وہ اپنی بچیوں کو پرورش عمدہ اسلامی طریقے کے مطابق کریں۔

پاکستانی معاشرہ دوطبقات میں واضح تقسیم نظر آتا ہے۔ امیری غریبی کے فرق نے اس معاشرے کو تفریق میں ڈال دیا ہے۔ افسانہ ''پاگل'' اسی فرق کا واضح عکاس ہے۔ جو پاکستانی معاشرے میں عدم توازن کی عمدہ مثال ہے۔ اس معاشرے میں امیروں کے بچوں کی ہر طرح کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے پیسے کی فراوانی ہے۔ زندگی کی ہر آسائش انھیں حاصل ہے۔ ان کے بچے بڑے بڑے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔لیکن غریبوں کے بچوں کی یہ کہہ کر دھتکار دیا جاتا ہے۔ کہ اگر ان کے پاس پہننے کو صاف کپڑے نہیں ہیں تو گندے کپڑے پہن کر سکول آنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ان سے دوسری لڑکیوں پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ تو ان سے کہا جاتا ہے۔ کہ تم غریبوں کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں، کھانے کو پیسے نہیں اور تعلیم کے پیچھے اس طرح بھاگتے ہو جیسے تعلیم کے بغیر تمھارا گزارا نہیں ہوسکتا۔ افسانے میں بملا غریب لڑکی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ جو پڑھنے کی بے حد مشتاق ہے۔ مگر وہ اپنی غربت و افلاس کی وجہ سے کسی اچھے سکول میں داخلہ نہیں لے سکتی تھی۔ اس کے مقابلے میں امیر شخص کی بیٹیاں پڑھائی سے دور بھاگتی ہیں۔ مگر وہ ان پر اپنا پیسا پانی کی طرح بہا رہا ہے۔ (۱۶) دراصل افسانہ نگار نے اس جانب سوچنے کی دعوت دی ہے۔ کہ اگر امیروں کا یہی پیسا ذہین غریب بچوں پر خرچ کیا جائے۔ تو معاشرہ بہت ترقی کرسکتا ہے۔ اور پاکستان دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اقوام کا آسانی سے مقابلہ کرسکتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں غربت انسان کو انتہائی پست سطح پر اترنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ ایسے ایسے کام کرنے کی حامی بھر لیتا ہے۔ جس میں اس کی زندگی کو شدید خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر ہر خطرے میں کود جاتا ہے۔ افسانہ ''جوانا مرگ'' اپنے نوجوان احمد کا قصہ جو انتہائی غربت کی حالت میں زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اور اس کے گھر والے دو دن سے فاقہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور جب اس کو سرکس سے پیش کش کی جاتی ہے۔ کہ اگر وہ سرکس میں ان کا مطلوبہ تماشا دکھائے تو بدلے میں اس کو اچھی خاصی رقم دی جائے گی۔ سرکس میں احمد نے ۱۰۰ (سو) فٹ کی بلندی سے اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر پانی کی ٹینکی میں کودنا تھا۔ اور اس کے عوض سرکس والے اس کو ۲۰۰ روپے کی رقم دینے والے تھے۔ مگر جب وہ سو فٹ کی بلندی س آگ لگا کر نیچے کودا تو ٹینکی تک پہنچنے سے پہلے ہی جھلس چکا تھا۔ اور پانی کی ٹینکی میں گرنے کے بجائے باہر گر کر فوت ہو چکا تھا۔ سرکس میں تماشا دیکھنے والے تبصرے کرتے ہوئے گزر رہے تھے کہ انسان پیسے کی ہوس میں کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ بھوک کا احساس انسان سے ہر طرح کی سوچ سمجھ چین لیتا ہے۔ اور وہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے ہر مشکل کو عبور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ (۱۷)

پاکستانی معاشرے میں غربت کا عفریت منہ کھولے کھڑا ہے۔ اور نچلی سطح پر زندگی گزارنے والے انسان تیزی سے اس کا ترلقمہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اس معاشرے میں فن اور فن کار کی کوئی قدر نہیں ہے۔ افسانہ ''تصویر'' ایک قلاش مصور کی زندگی کی عکاسی ہے۔ جس کے گھر میں بوڑھی غریب بیوہ ماں ہے۔ اور گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور نہ ہی ماں کے علاج کے لیے پیسے ہیں۔ شہر میں جب ایک تصویری مقابلے پر انعام کا اعلان ہوتا ہے۔ تو یہ فن کار ایسی شاہکار تصویر

بناتا ہے۔ جو اس کے اعلیٰ فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس کے کچے گھر میں ٹمٹماتے دیے کی لو بجھ جاتی ہے۔مگر وہ تصویر مکمل کر کے ہی دم لیتا ہے۔اس ساری رات اس کی ماں درد سے کراہتی رہتی ہے۔مگر وہ دوا کے لیے کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔وہ صرف اپنی ماں کو تسلی دیتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ اس کی تصویر اول انعام حاصل کرے گی۔مقابلے میں اس کی تصویر تمام بڑے مصوروں کے فن پاروں کو مات دیتے ہوئے اول انعام حاصل کر ہی لیتی ہے۔ ہر طرف سے لوگ اس کو مبارکباد دیتے ہیں۔مگر وہ مبارک بادوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گھر کی جانب دوڑتا ہے۔مگر گھر میں ماں کو ساکت حالت میں دیکھ کر وہ شاہکار تصویر یاد آجاتی ہے۔جس میں اس نے ایک جہاز کو زندگی اور موت کی کشمکش میں ڈوبتا اور ابھرتا ہوا دکھایا ہے۔اس کو لگا کہ اس کی ماں کی زندگی کا جہاز بھی ڈوب گیا ہے۔(۱۸)

غربت اور انسانی پیٹ کی بھوک بعض اوقات انسان سے وہ کام کراتی ہے۔جس کے بارے میں وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔افسانہ ''چل اے مجبور دل'' ہمارے اردگرد معاشرے میں رہنے والے سفید پوش افسانوں کی کہانی ہے۔افسانے میں سکینہ کا کردار ایک مضبوط عورت کا کردار ہے۔جو ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی بہو اور پوتے کے ساتھ مقیم ہے۔لیکن وہ جب اپنے پوتے کو بھوک سے بے حال دیکھتی ہے۔اور اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تو وہ باہر گلیوں میں نکل کر مانگنا شروع کر دیتی ہے۔اور جب اس کی بہو سوال کرتی ہے۔کہ یہ سب کھانا اور چیزیں کہاں سے آرہی ہیں؟ تو اس کی ساس جھوٹ بول دیتی ہے کہ اس کو ایک گھر میں صفائی کرنے اور برتن دھونے کی نوکری مل گئی ہے۔لیکن اس کی بہو کو شک ہوتا ہے کہ یہ کسی ایک گھر سے آیا ہوا کھانا نہیں ہے۔مگر ساس خاموشی سے سب چھپا لیتی ہے۔اور اس کو کھانا کھلاتی ہے۔ساس ہر روز مانگ کر لاتی اور اس کا پیٹ بھرتی۔ ایک دن مالک مکان نے انھیں گھر سے نکال دیا۔ راہ چلتے ہوئے ساس ایک راہگیر کے سامنے رک گئی۔اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔کہ میرا جوان بیٹا مر گیا۔ہم بے گھر اور در بدر ہیں۔ بہو یہ سب سن کر چکرا جاتی ہے۔مگر جب وہ ساس کی طرف دیکھتی ہے۔تو اس کی ساس دوسرے راہ گیر کے سامنے یہی الفاظ دہرا رہی ہوتی ہے۔غربت نے ساس کو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ مانگ مانگ کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔(۱۹)

غربت کی وجہ سے انسان کی سیرت کے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کرنا ہمارے معاشرے کا وطیرہ ہے۔اور جب کسی انسان کی دولت کو دیکھتے ہیں۔تو اس کی خامیوں کو بھول جاتے ہیں۔افسانہ ''چاند سے چاند تک'' میں شمس کا کردار انتہائی غریب لڑکے طور پر سامنے آیا ہے۔ چاند شمس کے ماموں کی بیٹی ہے۔شمس ماموں کے گھر چاند کے لیے رشتہ بھجواتا ہے۔مگر اس کا رشتہ محض اس لیے ٹھکرا دیا جاتا ہے کہ شمس غریب ہے۔ وقت گزرتا گیا اور شمس نے محنت کر کے خاندان کے پہلے سی پی ایس آفیسر ہونے کا شرف حاصل کر لیا۔اب کی دفعہ اس کے ماموں خود چاند کا رشتہ اس کے لیے لے کے آئے ہیں۔شمس سوچتا ہے کہ آخر دولت سے انسان ہر چیز خرید سکتا ہے۔دولت کی بدولت انسان اپنی محبت بھی خرید سکتا ہے۔(۲۰)

غریب انسان کی غربت اس کے لیے طعنہ بن جاتی ہے۔اور بعض اوقات امیر غریبوں سے ہمدردی کے عوض وہ

سب طلب کرتے ہیں۔جس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ افسانہ ''کنگن'' شاجو نامی عورت کی کہانی جو اپنے شوہر کو بچانے کے لیے دوائی کے پیسے مانگنے اس سیٹھ کے پاس جاتی ہے۔ جہاں اس کا شوہر کام کرتا ہے۔سیٹھ پیسوں کے عوض شاجو سے ایک رات مانگتا ہے۔مگر شاجو سیٹھ کی اس پیشکش کو ٹھکرا کر واپس آجاتی ہے۔اور سوچتی ہے کہ دنیا میں سے انسانیت ختم ہوگئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے قدموں میں بیٹھی یہی سوچتی رہتی ہے۔اس کا بھائی اس کے شوہر کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی بیوی کے کنگن اس کی جیب میں تھے۔ وہ اپنی بہن کی کسمپرسی اور بہنوئی کی لاچارگی دیکھ کر چپ چاپ چلا جاتا ہے۔آدھے گھنٹے بعد وہ دوائی کے ساتھ پھل اور کچھ پیسے شاجو کو دے کر چلا جاتا ہے۔جب وہ اپنے گھر کی جانب جاتا ہے۔تو اس کی جیب خالی ہوتی ہے۔(۲۱) ایسے افسانے معاشرے کے اس رخ کو پیش کرتے ہیں جہاں بہن بھائیوں کا ایک دوسرے کے لیے قربانی کا جذبہ عام ملتا ہے۔

غریب انسان صرف امیروں کی ہوس کا شکار نہیں بنتا بلکہ اکثر اوقات وہ معاشرے کے لیے خطرناک بھی بن جاتا ہے۔اور پھر وہ اپنے طرز عمل سے تمام معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔افسانہ ''اندر کا الاؤ'' ایک غریب نوجوان طالبعلم کی زندگی کی کہانی ہے۔ جو اپنی غربت کے باعث تعلیم جاری نہیں رکھ سکا۔ اور غلط لوگوں کی محبت میں پڑ کر وہ ایک غنڈہ بن گیا۔لوگوں کا قتل عام کرنا اس کے لیے ایک معمولی کھیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کالج میں وہ ہمیشہ اپنی غربت دور کرنے کے طریقے سوچا کرتا۔مگر اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایک ظالم زمیندار کا مطیع کارندہ بن کر سب کو اپنی دہشت سے مسحور کر لے گا۔مگر جب وہ اپنی گولیوں سے کراچی میں دہشت گردی پھیلا رہا ہوتا ہے۔تب ہی ان دنوں اسے ایک میگزین میں کچھ تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ان تحریروں کے ساتھ لاشوں کی تصویریں دیکھ کر وہ محسوس کرتا ہے۔ جیسے ان لاشوں میں ایک لاش اسی کی بھی ہے۔ باقی لاشیں اس کے ماں، باپ، بہن، بھائیوں کی ہیں۔اس کے اندر الاؤ جلنا شروع ہوا۔ دراصل یہ الاؤ تبدیلی کا استعارہ ہے۔ جو اس کو واپس نیک زندگی کی طرف راغب کر رہا ہے۔وہ سوچتا ہے کہ کس طرح اس نے ایک آدمی ہو کر آدم کے بیٹوں کو قتل عام کیا ہے۔اس کو لگا کہ روئے زمین پر ہر ظلم میں وہ برابر کا شریک ہے۔کشمیر میں یروشلم میں، بنگلہ دیش میں، اور کراچی میں ہر جگہ وہی ظالم ہے جو اپنے ہی بہن بھائیوں کے گلے کاٹ رہا ہے۔ وہ حالات سدھارنے کا عہد کرتا ہے۔(۲۲)

غربت ہی انسان کو ہر برے کام پر مجبور کرتی ہے۔وہ ہر جائز ناجائز کام سوچے سمجھے بغیر کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس غربت کی واضح تصویر ان افسانوں کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔

ماہنامہ ''عصمت'' کے اجراء کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسلامی معاشرے کے خدوخال کو واضح کیا جائے۔ برعظیم میں ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے مسلمانوں نے بہت سی سماجی برائیاں اختیار کر لی تھیں۔جن کی بھرپور مذمت کرتے ہوئے افسانے تحریر کیے گئے۔ بیوہ عورت، جہیز، امیر گھر میں شادیاں، اولاد کا نہ ہونا، بیٹی کے پیدا ہونے پر برا ماننا، کسی کی کالی رنگت کا مذاق اڑانا ان سب اور بہت سی دوسری برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور قارئین کو بتایا گیا کہ اسلامی نظام معاشرت کن اصولوں پر قائم ہے۔ان افسانوں کے کرداروں کی روشنی میں معاشرے کی بے رحمی اور سفاکی کھل کر

سامنے آتی ہے۔

ہندو معاشرے میں بیوہ عورت کو شوہر کے ساتھ ہی ستی کر دینے کا رواج عام تھا۔ یا پھر اس کو سفید کپڑوں میں ملبوس کر کے گھر کے کونے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی بیوہ عورت کو نحس، منحوس تصور کرنے لگے۔ ماہنامہ ''عصمت'' میں بہت سے افسانے بیوہ عورت اور اس کی لاچارگی کے متعلق تحریر کیے گئے۔ افسانہ دست گیری بیوہ عورت کی زندگی کی لاچارگی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مقصدی اور اصلاحی بھی ہے۔ افسانہ دو بیوہ عورتوں کے ارد گرد گھومتا ہے۔ جس ایک ساتھ ساحل سمندر پر خودکشی کرنے آتی ہیں۔ ان میں سے ایک غریب بیوہ اور دوسری امیر بیوہ ہے۔ غریب عورت کا بیوہ ہونے کے بعد کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ وہ بالکل دوسروں کی دست نگر بن کر رہ گئی ہے۔ اس کا دل بہت حساس ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے محنت مزدوری کرنے لگتے ہیں۔ مگر پھر بھی اکثر فاقے کی زندگی گزارتے ہیں۔ اس عورت کو سڑک پر مزدوری کرنے والا ہر بچہ اپنا لگتا ہے۔ اور وہ سمجھتی ہے۔ کہ اس معاشرے میں غرب، ان پڑھ اور بے سہارا بیوہ کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ س لیے وہ سمندر پر خودکشی کرنے آجاتی ہے۔ غریب عورت کو ملاقات امیر عورت سے ہوتی ہے۔ وہ بھی وہاں خودکشی کرنے آتی ہے۔ دونوں عورتوں کی خودکشی کی وجہ الگ الگ ہے۔ غریب عورت کے پاس اپنے بچوں کو کھلانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ جبکہ امیر عورت کے پاس پیسا بہت زیادہ ہے۔ اولاد نہیں ہے۔ اور لالچی رشتہ دار دولت کے حصول کے لیے اس کی چاپلوسی کرتے ہیں۔ وہ ان کے دھوکے کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ اس لیے خودکشی کا ارادہ کرتی ہے۔ مگر جب وہ غریب بیوہ سے ملتی ہے۔ اس کو اپنی زندگی کا مقصد نظر آنے لگتا ہے۔ اس کو پتا چلتا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اس کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے۔ وہ غریب عورت کے بچوں کو اپنا وارث بنانے اور ان کی پرورش کرنے کا بیڑا اٹھا لیتی ہے۔ اس افسانے کا ایک مقصد خودکشی کی ممانعت بھی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کسی مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر غریبوں کے بچوں کو امیروں کی سرپرستی میسر آجائے تو معاشرہ سدھر سکتا ہے۔ (۲۳)

ہمارا معاشرہ ایسا معاشرہ ہے۔ جہاں کسی کو بیوہ عورت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ معاشرے کی نظر میں بیوہ عورت زمین کا بوجھ ہے۔ اور اگر یہ بوجھ کم ہو تو عموماً لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح بیوہ عورت کو منحوس سمجھنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں بیٹی کی پیدائش کو بھی معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ افسانہ ''آتش گمنام'' ایک عورت جیراں کی کہانی ہے۔ جس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کی بناء پر اس کا شوہر شیرو دوسری شادی کر لیتا ہے۔ جیراں بہت غمزدہ ہوئی اور اپنے گھر کے پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ وہ بچپن سے لے کر جوانی تک جب بھی غمزدہ ہوتی تھی۔ اسی درخت کے نیچے آ کر بیٹھتی تھی۔ اور اپنا سارا دکھ اسے سناتی تھی۔ ایک دن اس نے گاؤں میں سنا کہ شیرو کا بیٹا ہوا ہے۔ وہ پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ اور شیرو کے بیٹے کو اپنا دشمن تصور کرتے ہوئے اس کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگی۔ کیوں کہ صرف اس نوزائیدہ بچے کے حصول کے لیے شیرو نے جیراں پر سوکن لا کے بٹھا دی تھی۔ اس رات جیراں نے شیرو کے بیٹے کو گھر سے اٹھا لیا اور پٹڑی پر جا کر لٹا

دیا۔مگر اس کی خوب صورت آنکھوں کی کشش نے جیراں کو متوجہ کر لیا۔اور اس نے بچے کو خود سے چمٹا لیا۔اور ٹرین میں بیٹھ گئی۔مگر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔وہ شیرو کے بیٹے کی پیدائش کے بعد درخت کے نیچے آ بیٹھی تھی۔مگر اب اس نے ارادہ کر لیا تھا۔کہ وہ شیرو کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا کر پالے گی۔اس کے اندر رقابت کا جذبہ ختم ہو کر مامتا کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔(۲۴)

اسلام نے ذات پات رنگ و نسل کی تمیز ختم کر کے ایک تقویٰ کو برتری کی بنیاد قرار دیا۔مگر ہمارا معاشرہ آج بھی رنگ و نسل کو ہی امتیاز دیتا ہے۔خصوصاً لڑکیوں کا رنگ کالا ہو جائے تو ان کا جینا دشوار کر دیا جاتا ہے۔افسانہ ''رنگت'' انسانی احساسات، جذبات اور نفسیات پر مبنی عمدہ تحریر ہے۔اور ہمارے معاشرے میں بنائے گئے رنگوں کی تفریق پر عمدہ طنز بھی ہے۔صفیہ اور اس کے خاندان میں گورا رنگ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔صفیہ کے ہاں پہلی بیٹی روزی تھی۔جو انتہائی گوری تھی۔اس وجہ سے وہ سب کو بہت پسند تھی۔ہر شخص کی آنکھ کا تارہ تھی۔مگر جب روبی پیدا ہوئی تو اس کا رنگ سانولا تھا۔جس کی وجہ سے اس کو گھر میں دوسرے درجے کا فرد بن کر زندگی گزارنی پڑی۔اس کے رنگ کو ہدف تنقید بنایا جاتا۔مگر خدائی قدرت صفیہ کے ہاں جب تیسری لڑکی ثمینہ نے جنم لیا۔وہ کالی سیاہ تھی۔گھر، باہر ہر جگہ ثمینہ کے کالے رنگ کا مذاق اڑایا جاتا۔وہ بچپن سے ایسے جملے سننے کی عادی ہو گئی تھی کہ کاش یہ پیدا نہ ہوتی۔اسے تو کوئی بھنگی فقیر بھی بیاہ کر نہ لے جائے گا۔اس طرح ثمینہ سب سے کٹ کر تنہا رہنے لگی۔اور شدید بیمار پڑ گئی۔ثمینہ ہسپتال کی ایمرجنسی وارڈ میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔جب روبی نے زبردستی اسے ملنے کی خواہش کی اور وہ وہاں جا کر ڈاکٹر کی منتیں کرنے لگی کہ وہ ثمینہ کو بچا لے۔ڈاکٹر روبی سے بہت متاثر ہو کر پوچھتا ہے۔کہ کیا اس کو بہن سے بہت پیار ہے؟ تو وہ چپ کر کے یہی کہتی ہے کہ اگر ثمینہ مر گئی تو وہ گھر میں سب سے کالی بن جائے گی۔(۲۵)

ہم نے خود ساختہ اصولوں کو اپنے سر پر اتنا سوار کر لیا ہے کہ ثمینہ کی جان بچانے کے لیے دعا کرنے کے بجائے محض اس لیے بچانے کی التجائیں کی جا رہی ہیں کہ اس کی وجہ سے روبی کو گھر میں ہدف تنقید بننا پڑتا تھا۔یہاں انسان اپنی انسانیت سے گر کر اسفل ترین سطح پر پہنچ جاتا ہے۔وہ انسان جسے فرشتوں نے سجدہ کیا۔اکثر اوقات حیوانوں سے بھی بدتر بن جاتے ہیں۔افسانہ ''مسجود ملائک'' معاشرے میں ختم ہوتی ہوئی انسانیت اور وحشت و بربریت کا عمدہ عکاس ہے۔افسانہ ایک راہ چلتے پاگل انسان سے شروع ہوا ہے۔جس کو راستے میں ایک ٹوٹی ہوئی گڑیا ملتی ہے۔وہ ہذیانی انداز میں اس کو محلے کی ایک نالی میں رکھ کر اینٹ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔مگر اس وجہ سے نالی کا پانی سب گھروں میں پھیل جاتا ہے۔سب عورتیں گھروں سے نکل کر ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کرتی ہیں کہ نالی دوسری نے بند کی ہے۔اچانک محلے کا ایک بچہ کہتا ہے کہ نالی میں پڑی ہوئی گڑیا اس کی ہے۔محلے کی ایک عورت خورشید اس بچے محمود کے پیٹ میں اتنی زور سے لات مارتی ہے۔کہ اس کی آنتیں ابل کر سامنے آ جاتی ہیں۔اور وہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔کیا یہ انسان اس قابل ہیں کہ انھیں فرشتے سجدہ کرتے۔آج کا انسان انسانیت کی پست سطح پر گر چکا ہے۔وہ خود اس بات کو بھول گیا ہے کہ کل کو اس نے رب کی

بارگاہ میں حاضر ہو کر جواب بھی دینا ہے۔ (۲۶) ایسے افسانے انسان کی انسانیت پر گہرا طنز ہیں کہ یہ انسان جس کو زمین پر نائب بنایا گیا ہے۔ وہ اس قابل بھی نہیں کہ اسے انسان کہا جائے۔

افسانہ ''نیا انسان'' کا موضوع اور کہانی دونوں ہی نئے ہیں۔ افسانہ غریب بوڑھے کلرک اور اس کی بیٹی فروزاں کے بارے میں ہے۔ فروزاں گونگی بہری لڑکی ہے۔ اس کا جو بھی رشتہ آتا۔ جب انھیں پتا چلتا ہے کہ لڑکی گونگی بہری ہے۔ تو وہ رشتے سے انکار کر دیتے۔ بوڑھا کلرک بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں سخت پریشان تھا۔ ایک دن اس نے اپنے دفتر میں ساجد نامی شخص سے ملاقات کی۔ جو اس سے ایک خط ٹائپ کرواتا ہے۔ وہ خط دراصل شادی کا ایک پیغام ہوتا ہے۔ چوں کہ ساجد دنیا میں اکیلا تھا۔ اس لیے وہ یہ طریقہ ڈھونڈ نکالتا ہے کہ وہ فروزاں کے والد سے یہ پیغام ٹائپ کروائے۔ اس طرح وہ ساجد کے بارے میں بہتر جان سکیں گے۔ بوڑھا کلرک خط ٹائپ کر کے دیتا ہے۔ تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ ساجد یہ خط کہاں بھجوانا چاہتا ہے۔ مگر گھر آ کر جب وہ پیغام ڈاک کے ذریعے اسے ملتا ہے۔ تو وہ بہت حیران ہوتا ہے کہ اتنا خوش اخلاق اور ہنس مکھ نوجوان ان کے گھر پیغام کیسے بھیج سکتا ہے۔ وہ بوڑھا اپنے دل میں سوچتا ہے کہ وہ ساجد کو فروزاں کے متعلق سب تفصیلات فراہم کر دے گا۔ کہ وہ گونگی بہری لڑکی ہے۔ جب وہ ساجد کو یہ بتانے جاتا ہے۔ تو یہ سن کر حیران رہ جاتا ہے۔ کہ ساجد کو سب کچھ معلوم ہے۔ پھر وہ اسے نئے انسان کا خطاب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ وہ نیا انسان ہے۔ جو عورت کی عزت کرنا جانتا ہے۔ اس کی جوانی کا نہیں اس کی عزت کا پرستار ہے۔ ایسا انسان جو گونگی بہری لڑکی کے ساتھ بھی زندگی کا سفر طے کر سکتا ہے۔ یہی نئے انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ (۲۷)

ہمارے معاشرے میں لوگ اپنی بیٹیوں کو بہت سا جہیز دینے اور امیر گھروں میں بیاہنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ افسانہ ''خاک کا مقدر'' میں زینی ایسی لڑکی کا کردار ہے۔ جو محل میں ٹھیکیدار کی بیٹی کی شادی کا قیمتی جہیز دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وہ اور اس کی سہیلیاں پہروں بیٹھ کر قیمتی جہیز اور امیروں کے گھروں میں شادیوں پر بحث کرتیں۔ زینی کا رشتہ لطیف سے کیا گیا۔ جو ان ہی کی طرح غریب تھا۔ زینی کو ہمیشہ یہ خیال ستاتا رہتا کہ اس کے ماں باپ کے پاس اس کو دینے کے لیے قیمتی جہیز نہیں اور اب اس کو سسرال میں طعنے سننے پڑیں گے۔ مگر اس کا یہ خوف شادی کے بعد رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ لطیف اور اس کے ماں باپ کوئی بھی کام اسے مشورہ لیے بغیر نہیں کرتے تھے۔ تو اسے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے زینی کی زندگی خوشگوار ہوگئی۔ ایک سال بعد وہ ایک پیارے بچے کامران کی ماں بن گئی۔ اور اس سارے عرصے میں وہ ٹھیکے دار کی بیٹی اور قیمتی جہیز ہر چیز بھول گئی۔ ایک دن میکے جاتے ہوئے زینی کو ٹھیکے دار کی بیٹی ملتی ہے۔ وہ میک اپ کرنے کے باوجود شدید علیل لگ رہی تھی۔ دراصل وہ اپنے سسرال والوں پر قیمتی جہیز کا رعب ڈالتی تھی۔ مگر جب تعلقات خوشگوار نہ ہوں۔ تو قیمتی جہیز کوڑے کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ سسرال والوں کو دکھ درد میں شریک بہو کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ کہ امارت جتانے والی ایک کٹھ پتلی کی۔ اس طرح ٹھیکے دار کی بیٹی کو اس کے قیمتی جہیز سمیت واپس بھیج دیا گیا۔ (۲۸) یہ

افسانہ اور اس جیسے کئی دوسرے افسانے جہیز کی برائی اور مذمت میں تحریر کیے گئے۔جن میں ہر حوالے سے بحث کر کے بتایا گیا کہ جہیز ایک لعنت ہے۔جس کو ختم ہونا چاہیے۔

بہت سے افسانے مغربی کلچر اور روایات اپنانے والوں کی مذمت میں تحریر کیے گئے ہیں۔افسانہ ''کوا چلا ہنس کی چال'' میں اس کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس افسانے میں نسیم ایک پڑھے لکھے مرد کی صورت سامنے آتا ہے۔وہ اپنے گھر والوں کی مرضی کے مطابق شاہینہ سے شادی کے لیے راضی نہیں ہے۔کیوں کہ وہ صرف میٹرک پاس ہونے کے ساتھ ساتھ گاؤں میں رہتی ہے۔نسیم ایک تعلیم یافتہ اور جدید بیوی کی تلاش میں ہے۔نسیم کے گھر والے نسیم کی شادی شاہینہ سے کر دیتے ہیں۔نسیم شاہینہ کو ماڈرن بنانے کے لیے کلبوں میں لے جانا شروع کر دیتا ہے۔شاہینہ اپنے دل میں نسیم کے ان جدید خیالات کو شکست دینے کا ارادہ کرتی ہے اور وقت بے وقت مرد دوستوں کے ساتھ کلب میں پھرنا شروع کر دیتی ہے۔پہلے پہل نسیم بہت خوش ہوتا ہے کہ اس کی بیوی نے جدید اطوار سیکھ لیے ہیں۔مگر جب وہ شوہر اور بچوں سے بے نیاز پھرتی ہے تو نسیم کو احساس ہوتا ہے کہ اس نے کچھ غلط کیا ہے۔وہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنا تبادلہ دوسرے شہر کرا لیتا ہے۔شاہینہ بہت خوش تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو گمراہ ہونے سے بچا لیا تھا۔اس افسانے کے ذریعے عورتوں کو صلاح دی گئی کہ وہ اپنے حالات کو سنوارنے کے لیے خود محنت کریں اور اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاریں۔(۲۹) الغرض یہ اور بہت سے دوسرے افسانوں کے ذریعے جدیدیت کے نام پر اپنائے جانے والی فحاشی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

ماہنامہ ''عصمت'' میں شائع ہونیوالے تمام افسانوں کا اسلوب سادہ، شستہ اور عام فہم ہے۔ان افسانوں کے پلاٹ کردار اور کہانی کی بنت سیدھے سادے اسلوب کی غمازی کرتے ہیں۔چوں کہ یہ ماہنامہ صرف اعلیٰ، باذوق اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ہی شائع نہیں ہوتا تھا، بلکہ گھروں میں بیٹھی بہت سی نیم خواندہ مستورات بھی اس ماہنامے کو پڑھتی تھیں۔اور بعض ان پڑھ عورتیں اس کو دوسروں سے پڑھوا کے سنتی تھیں۔اس لیے ان تمام افسانوں کا انداز بیان انتہائی رواں اور آسان ہے کہ پڑھنے والے کو تمام بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ابلاغِ خیال ان افسانوی تحریروں کا حقیقی مقصد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلوب کی پیچیدگیوں کی بجائے، خیال یا نقطۂ نظر کی وضاحت وصراحت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

اس دور کے اردو افسانے پر مختلف تحریکوں کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کو دیکھا جائے تو ان میں ترقی پسندی، جدیدیت، علامتی افسانے اور حلقہ ارباب ذوق جیسی تحریکوں کے زیر سایہ بہترین ادب اپنے فنی عروج پر نظر آتا ہے۔مختلف ادوار میں ان تحریکوں نے براہ راست ادب اور ادیب دونوں کو متاثر کیا۔لیکن ماہنامہ ''عصمت'' کے افسانوں پر ان تمام تحریکوں کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہنامہ ''عصمت'' کے افسانہ نگار ایک جانب تو غیر معروف تھے اور دوسرے وہ کوئی باقاعدہ لکھاری بھی نہیں تھے۔یہ عام طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔جن کے افسانوں میں زندگی کے عام مسائل اور ان کے حل تو نظر آتے ہیں مگر ان افسانوں کو ادبی معیار پر پرکھا نہیں جا سکتا۔

ماہنامہ ''عصمت'' ادبی ماہنامہ نہیں معاشرتی اور اصلاحی ماہنامہ ہے۔ جس کا مقصد اصلاح معاشرہ ہے۔ چناں چہ اس میں شائع ہونے والے افسانوں پر مقصدیت کا گہرا غلبہ نظر آتا ہے۔ یہ افسانے ہر جگہ اپنے مقصد کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں پر مقصدیت اتنی غالب ہے کہ کہانیاں بعض اوقات کہانیوں کے بجائے طویل مکالمے معلوم ہوتی ہیں۔ اور قاری ان سے اکتانے لگتا ہے۔ اسی دور میں سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس وغیرہ کے افسانے عروج پر تھے۔ لیکن ماہنامہ ''عصمت'' کے افسانوں میں ان ممتاز افسانہ نگاروں کی سی بلندی اور فنی پختگی نظر نہیں آتی۔ حالاں کہ موضوعات کے حوالے سے ماہنامہ ''عصمت'' معاشرتی تبدیلیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ان افسانوں میں تبدیلی کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔ تقسیم پاکستان کے موضوع پر بہت سے افسانے لکھے گئے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی افسانہ منٹو، احمد ندیم قاسمی یا قرۃ العین حیدر کے تقسیم پاکستان پر لکھے گئے افسانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح دوسرے موضوعات پر بھی تحریر کردہ افسانے معاشی اور معاشرتی کشمکش کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن اپنے دور کے کسی ممتاز افسانہ نگار کے افسانوں کی طرح شہرت حاصل نہیں کر پائے۔

حواشی

(۱) قیصر جہاں بیگم، آنسو، مشمولہ عصمت، کراچی، شمارہ جنوری ۱۹۴۹ء، جلد ۸۲، نمبر ۱، ص ۳۳
(۲) اختر بیگانہ، ''مدھ بھرے نین، ایضاً، شمارہ اکتوبر ۲۲۶ء ۱۹۹۳، نمبر ۶، ص ۳۳
(۳) وحیدہ نسیم، روشن راہیں، تاریک منزل، ایضاً، شمارہ جولائی ۱۹۷۱ء جلد ۱۲۱، نمبر ۱، ص ۲۷
(۴) کنیز فاطمہ، ہفت اغلاط، ایضاً، شمارہ مئی ۱۹۴۹ء، جلد ۸۳، نمبر ۳، ص ۲۱۳
(۵) مریم مدنی، نگار، ایضاً، شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء جلد ۱۱۵، نمبر ۱، ص ۹۷
(۶) امتہ الوحی، ٹی پارٹی، ایضاً، شمارہ فروری ۱۹۴۹ء جلد ۸۲، نمبر ۴، ص ۷۶
(۷) ماہ منیر، بکواس تو نہ تھی، ایضاً، شمارہ دسمبر ۱۹۶۶ء، جلد، نمبر ۱، ۱۱۷ ص ۳۶۱
(۸) ماہ منیر عروج، وہ احمق نہ تھی، ایضاً، شمارہ فروری ۱۹۶۹، جلد ۱۲۰، نمبر ۱ء، ص ۱۷
(۹) کیفی عظمت، نئی روش، ایضاً، شمارہ اکتوبر ۱۹۶۸ء جلد ۱۱۹، نمبر ۴، ص ۲۷
(۱۰) عائشہ صدیقہ، بوبو جان، ایضاً، شمارہ جولائی ۱۹۹۲ جلد ۲۲۲، شمارہ نمبر ۳ء، ص ۲۵
(۱۱) بلقیس بیگم، نوابن، ایضاً، شمارہ مارچ ۱۹۹۳ جلد ۲۱۶، نمبر ۲ء، ص ۱۱
(۱۲) آثم میرزا، تیرگی کے پاسبان، ایضاً، شمارہ نومبر ۱۹۸۸، جلد ۲۱۷ء، ص ۳۴
(۱۳) ماہ منیر عروج، ایک سوال، ایضاً، شمارہ اگست ۱۹۹۳ء جلد ۲۲۷، ص ۱۴۲
(۱۴) بدرالنساء، بچے کی نفسیات، ایضاً، شمارہ اکتوبر ۱۹۶۸ء۔ جلد ۱۱۹، نمبر، ص ۹
(۱۵) نور جہاں تنویر، میں اکیلی رہ گئی، ایضاً، شمارہ مارچ ۱۹۸۲ء جلد، ص ۳۰
(۱۶) وحیدہ نسیم، گھر سے دور، ایضاً، شمارہ اپریل ۱۹۶۴ء، ص ۱۹۰

(۱۷) زیب سعید، پاگل، ایضاً، شمارہ مئی ۱۹۴۹، جلد ۸۳، نمبر ۳، ص ۲۰۳
(۱۸) آمنہ نازلی، جوانا مرگ، ایضاً، شمارہ اگست ۱۹۴۸ء، جلد ۸۱، نمبر ۴، ص ۷۲
(۱۹) عبدالمعید خان، تصویر، ایضاً، شمارہ فروری ۱۹۹۷ جلد ۲۷۰ء، ص ۳۳
(۲۰) اختر جہاں، چل اے مجبور دل، ایضاً، شمارہ جنوری ۲۰۰۶ء، جلد ۳۳۹، شمارہ ۱، ص ۹
(۲۱) سید انصار الہدیٰ، چاند سے چاند تک، ایضاً، شمارہ اکتوبر ۱۹۷۱ء جلد ۱۲۲، نمبر ۴، ص ۳۷
(۲۲) عبدالمعید خان، کنگن، ایضاً، شمارہ فروری ۱۹۸۲ء جلد ۱۳۱، نمبر ۱، ص ۲۷
(۲۳) آثم میرزا، اندر کا الاؤ، ایضاً، شمارہ اپریل ۱۹۹۸ء جلد ۲۸۱، نمبر ۲، ص ۴۶
(۲۴) علی احمد شاہدی، دستگیری، ایضاً، شمارہ مارچ ۱۹۷۰ء جلد ۱۱۸، شمارہ ۱ء، ص ۱۴۰
(۲۵) عصمت رضوان، آتش گمنام، ایضاً، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء، جلد ۳۳۹ شمارہ ۴، ص ۲۳
(۲۶) ڈاکٹر صدیق احمد، رنگت، ایضاً، شمارہ نومبر ۲۰۰۴ء جلد ۳۳۱، شمارہ نمبر ۲ء، ص ۵
(۲۷) طارق احمد، مسجود ملائک، ایضاً، شمارہ جولائی ۱۹۷۷ء جلد ۱۲۱، شمارہ ۴ء، ص ۵۷
(۲۸) کوثر چاند پوری، نیا انسان، ایضاً، شمارہ جولائی ۱۹۵۸ء، جلد ۹۲، نمبر ۱، ص ۲۴۸
(۲۹) سید ابو عاصم، کوا چلا ہنس کی چال، ایضاً، شمارہ جون ۱۹۹۴ء جلد ۲۲۹، نمبر ۱، ص ۴۰

رسائل:

(۱) ماہنامہ عصمت (۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۶ء)، عصمت بک ڈپو، کراچی